ایک بین اقوامی ادبی اور ثقافتی ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ISSN 0971 - 846 X

ایڈیٹر انچارج:
عابد کرھانی
فون 24369189

معاون: نرگس سلطانہ

جلد: ۶۳ شمارہ: ۷
فروری ۲۰۰۵ء ماگھ - پھالگن شک ۱۹۲۶

کمپوزنگ : افتخار احمد
سرورق : وگیان ورت
بیک کور : ہمت رائے شرما

بزنس منیجر: شکنتلا

آجکل کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

فی شمارہ: سات روپے سالانہ: ۷۰/ روپے
دو سال: ۱۳۵/ روپے تین سال: ۱۹۰/ روپے
امریکہ، یورپ اور دوسرے ممالک کے لیے بذریعہ ہوائی ڈاک سالانہ ۷۰۰/ روپے
پڑوسی ممالک کے لیے بذریعہ ہوائی ڈاک سالانہ ۵۰۰/ روپے

Website: Publicationsdivision.nic.in
E-mail: a) dpd@sb.nic.in
b) dpd@hub.nic.in

خریداری و اشتہار کے لیے منی آرڈر، چیک، ڈرافٹ، پوسٹل آرڈر
'ڈائریکٹر پبلی کیشنز ڈویژن' کے نام اس پتے پر بھیجیں
جگدیش پرساد بھارتی
بزنس منیجر (سرکولیشن اینڈ ایڈورٹیزمنٹ)
جرنلس یونٹ، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۷
آر۔کے پورم نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۶۶
رسالے سے متعلق استفسار اور شکایتیں بھی اے۔بی۔ایم کو ہی لکھیں

مضامین / تخلیقات سے متعلق خط - کتابت کا پتا:
ایڈیٹر 'آجکل' (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، ۷-۱۲ سوچنا بھون
سی۔جی۔او کمپلیکس، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۳

ترتیب

ملاحظات:
اردو شاعری میں حقوق انسانی کی جھلک — شاہد شاد عثمانی — ۲

غالب نامہ:
غالب کی سرگزشت سیر و سیاحت — ایچ۔اے سید — ۳
غالب اور آل احمد سرور — شمس بدایونی — ۸
غالب کے منقبتی قصائد کا تجزیاتی مطالعہ — مرزا شفیق حسین شفق — ۱۱
خطوط غالب میں ان کے عہد کا سیاسی — حسن مثنی — ۱۵
نذر غالب (غزلیں) — شاہین، مظفر حنفی، ایم قمرالدین — ۹

مقالات:
اردو ادب میں اولیت کے سہرے — مظہر امام — ۲۰
علی جواد زیدی کی نظم گوئی ایک جائزہ — عابد حسین حیدری — ۲۳

نظمیں:
پرتو جمال — رخسانہ — ۲۸
سڑک — ایم کو ٹھیاوی راہی
تتلیاں، لکیریں — نسیم عزیزی

غزلیں:
سعید الظفر چغتائی، نجیب رامش، راز اعظمی — ۲۹
قمر سنبھلی، محمد شاہد پٹھان، راشد انور راشد — ۳۰
بدر واسطی، راحت حسن، حسن رہبر — ۳۱

افسانے:
روپیہ۔ڈالر — یسین احمد — ۳۲
سسکی — اشوک پٹواری — ۳۴
عیدی — رضا جعفری — ۳۷
میں ہوا نہیں، تو دیا نہیں — عظیم اقبال — ۳۹

طنزومزاح:
'د' — مرزا کھونچ — ۴۱

تبصرہ وتجزیہ:
اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب — شافع قدوائی — ۴۲

تبصرے: — مبصر: — ۴۴
پرچم گردباد / مظفر حنفی — ممتاز الحق
ابابیلیں نہیں آئیں / حنیف ترین — محمد ابوذر
سید محمد ازہر شاہ قیصر / نسیم اختر قیصر — منور حسن کمال

کہتی ہے خلق خدا .... — ۴۷

عابد حسین حیدری

علی جواد زیدی کی نظم گوئی: ایک جائزہ

ترقی پسند تحریک کا آغاز ایسے دور میں ہوا جب ملک کے عوام غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر برطانوی سامراج سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اس وقت ہندوستانیوں کو سب سے اہم ضرورت آپسی اتحاد کی تھی اور انگریزی سامراج اس اتحاد کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس وقت ایسے ادیبوں اور شاعروں کی ضرورت تھی جو ہندوستانی عوام کو ایک رکھ سکیں۔ اس تحریک سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں نے مختلف قسم کی ہنگامی نظمیں لکھنا شروع کیں۔ ان ہنگامی نظموں کے موضوعات مختلف النوع تھے۔ یہ موضوعات کچھ تو اندرونی تھے اور کچھ بیرونی۔ اندرونی موضوعات میں قومی لیڈروں کی شخصیتیں اور ان کے کارنامے، غلامی سے چھٹکارہ، ہندو مسلم اتحاد، بھوک، افلاس، قحط، کارخانوں اور ملوں کے مزدوروں وغیرہ کے مسائل تھے۔ جہاں تک بیرونی موضوعات کا تعلق ہے ان میں کارل مارکس، لینن، لال جھنڈا، کمیونسٹ تحریک، اشتراکیت، روسی انقلاب وغیرہ شامل تھے۔ چند برسوں میں ان اندرونی اور بیرونی موضوعات پر اس قدر تیزی سے نظمیں لکھی گئیں کہ ان کا ایک دفتر تیار ہو گیا۔ ان نظموں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تمام کی تمام نظمیں دیکھا دیکھی اور فیشن کے طور پر کہی گئیں اور ان کے ذریعہ کمیونزم کا پرچار بھی دل کھول کر کیا گیا۔ ایسی نظموں میں فنی محاسن کم اور نعرہ بازی زیادہ ہے۔ یہ نظمیں تخیلی کس بل سے الگ بنے بنائے سانچے میں ڈھال کر نکالی گئیں۔ آگ، بجلی، خون، آندھی، طوفان، کل، کارخانہ، مزدور اور گولہ بارود جیسے گھن گرج والے الفاظ کی نمائندگی ایسی نظموں میں زیادہ کی گئی ہے لیکن اس سے قطع نظر اس عہد میں ایسی تخلیقات بھی پیش کی گئیں جن میں ایک رسیلہ پن اور نرم و مانوس انداز بھی تھا اور ترقی پسندی کے مخصوص انداز بیان سے ہٹ کر فن کو فن کی حیثیت سے برتا گیا اور شعری محاسن سے پہلو تہی نہیں کی گئی۔ علی جواد زیدی ان شعرا میں سے ایک ہیں جو مندرجہ بالا خصوصیات کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنی تصنیف "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" میں زیدی کی نظم گوئی سے متعلق لکھا ہے:

> "اپنے ابتدائی رومانوی دور سے نکلنے کے بعد علی جواد زیدی نے زندگی کے بعض دوسرے مسائل پر پختہ انداز میں چیزیں لکھیں۔ علی جواد زیدی نے اردو کے کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اس کے ساتھ ہندی ادب سے ان کو بہت لگاؤ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ابتدا ہی سے ایک رسیلہ پن اور نرم و مانوس انداز ہے۔ ان کی انقلابی نظموں میں گھن گرج کے بجائے گیتوں کا بہاؤ اور گھلاوٹ ہے۔"

آزادی سے قبل زیدی کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جو وقتی موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں شعریت کم اور مشق سخن زیادہ ہے۔ انہوں نے سیاسی موضوعات پر بھی لکھا ہے مگر وہ موضوعات محض اخبار کی سرخیاں نہیں بلکہ ان میں زندگی کے تجربات بھی شامل ہیں۔ علی جواد زیدی نے اپنے مجموعے 'شیشہ آواز' کے مقدمے میں لکھا:

> "میری نظموں کے محرک میرے ذاتی مشاہدات و محسوسات و مطالعات ہیں۔ زبان و بیان کا خیال تو سبھی رکھتے ہیں لیکن مجھے فکری عنصر بھی عزیز ہے۔"

یہاں پر یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ علی جواد زیدی طالب علموں کی سیاست میں پیش پیش تھے۔ زیدی نے خود اس کا ذکر اپنے مجموعہ 'رگ سنگ' میں کیا ہے:

> "میرے محبوب ترین مشغلے دو ہی تھے، ادب اور سیاست۔"

علی جواد زیدی بائیں بازو کے افکار سے متاثر ہو کر سیاست میں داخل ہوئے تھے اور طلبا کی تحریک ہی سے زیدی کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی نظموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) ہنگامی نظمیں، (۲) آزادی کے بعد کی نظمیں۔ ذیل میں علی جواد زیدی کی چند ہنگامی نظموں کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

صدر شعبۂ اردو، ایم جی ایم (پی جی) کالج، سنبھل مراد آباد۔ ۲۴۴۳۰۲

علی جواد زیدی طالب علموں کی تحریک کو ہندوستانی بیداری اور آزادی کی عام تحریک سے الگ نہیں سمجھتے۔ وہ طالب علموں کی سیاست کو جوانی کا اُبال نہیں بلکہ زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں اور ان کو ہر شعبۂ حیات اسی سے وابستہ دکھائی دیتا ہے۔ رومان و انقلاب اور طرزِ قدیم کی آمیزش نے بھی ان کی شاعری میں اپنا رنگ جمایا ہے۔ ان کی ایک نظم 'تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟' ایک مدت تک بہت مقبول رہی۔ یہاں عورت کا روایتی اور ترقی پسند تصور ایک دوسرے سے برسرِپیکار محسوس ہوتا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق اس نظم میں محبوبہ پھول کی پنکھڑی سے بھی زیادہ نرم و نازک ہے، اس لیے وہ آلام و مصائب برداشت نہیں کر سکتی۔ محبوبہ ان سنگین مسائل کو سمجھ نہیں سکتی اور نہ اس کی معصومیت اور نرمی اس کی تاب لا سکتی ہے اور جب محبوبہ یہ کہتی ہے کہ وہ بھی اس جنگ میں اس کے ساتھ چلے گی تو اسے یقین نہیں آتا کہ وہ اس طوفان کا کیسے مقابلہ کر سکتی ہے۔ اس نظم کا درج ذیل بند ملاحظہ فرمائیں:

تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟
تم حسن و نزاکت کی دنیا تم اس دنیا کو کیا جانو
یہ راہ کٹھن یہ کوس کڑے کچھ سوچ تو لو کچھ پہچانو
اس راہِ خطر سے لوٹ چلو گھر جاؤ مرا کہنا مانو
تم ساتھ کہاں تک جاؤ گی؟

دراصل یہ متوسط طبقہ کے ان تمام نوجوانوں کی جذباتی سرگزشت تھی جو جاگیردارانہ گھرانوں سے نکل کر تعلیم اور ادب کے راستے سے اشتراکی تحریکوں میں آئے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اسے وہ زندگی کا مقصد مان لیتے ہیں اور اسی سے ہر شعبۂ حیات کو وابستہ سمجھتے ہیں۔

علی جواد زیدی کی ایک نظم 'ہم جماعت خاتون' کی پہلی گفتگو کا یہ اثر ہوا:

خامشی سے کھولتے پانی کے چشمے جم گئے
چل رہے تھے دل میں جو بجلی کے پنکھے تھم گئے

اور جس کی گفتگو کا یہ اثر ہو اس سے شاعر کیا چاہتا ہے:

اٹھ بدل دے صورت تعمیر میں تخریب کو
ایک دیوی کی ضرورت ہے نئی تہذیب کو

یہاں زیدی کی شاعری زندگی سے اتنی قریب ہے کہ ہر شخص اسے سمجھ سکتا ہے۔

زیدی نے اپنے ماضی سے رشتہ توڑنے کے ساتھ ساتھ عمل کی نئی دنیا تعمیر کرنے کے لیے جس آمادگی اور جس تبدیلی کی ضرورت محسوس کی ہے اسے 'کایا پلٹ' میں ملاحظہ فرمائیں

وہ بھوک اور پیاس کے لمحے گزر گئے — جب دل کو فکر تھی طلب مدعا کرے
خودداریاں جو روک رہی تھیں سوال سے — دل میں دعائیں کرتے تھے اکثر خدا کرے
اب بے سوال دل کے ارادے ہی اور ہیں — تدبیر اس کو جلد عمل آشنا کرے
سر پر عمل کا تاج ہے تاجوں کا بادشاہ — ہمت کسی میں ہو تو ذرا سامنا کرے

علی جواد زیدی سماج میں پھیلے ظلم و جور، ناانصافی و نابرابری جیسے عناصر کو پوری طرح محسوس کر لیتے ہیں اور ان چھوٹے چھوٹے عناصر کو بھی تلاش کرتے ہیں جن کے رشتے سماج کے بڑے بڑے مسائل سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی نظم 'چند مناظر' میں ان کیفیات کی پوری نمائندگی ہوتی ہے جس کا عالمانہ ادراک کر لینے کے بعد عمل کی منزل ہے۔ ان مناظر میں زندگی، ٹوٹے جھونپڑے، تڑپتے بچے، قسمت کے جھوٹے قصے، مزدوروں کے زرد چہرے، اندھیری رات، شکستہ دل، بھکارن، خون کا پیاسا بھائی، شکاری ملا، جنگ کی طرف جاتی ہوئی دنیا، سر بیچنے والا مرد مفلس، بے بس تہذیب، میدان جنگ کا بینڈ اور بیوہ کی فغاں سب کچھ پیش کر رہی ہے۔ زیدی نے اس نظم میں بندھے ٹکے موضوع کو نہیں اپنایا ہے بلکہ متنوع مناظر کو سمیٹ دیا ہے اور اس الزام کو باطل کر دیا کہ ترقی پسند شاعروں کے یہاں متنوع اور وسیع موضوعات نہیں ہیں۔ یہ نظم زیدی کی شاہکار نظم ہے۔ اس کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

میدان میں بینڈ بج رہا ہے — بیوہ کی فغاں سے زرد لے کر
اور موت ترانے گا رہی ہے — انسان کی آہ سرد لے کر
دنیا سے وہ چل بسے سپاہی — افلاس کا روئے زرد لے کر
اور میں ابھی سوچ ہی رہا ہوں

اس نظم میں 'اور میں ابھی سوچ ہی رہا ہوں' کی بار بار تکرار اس جذبے کے لیے ملامت کے پہلو کو بھی اجاگر کرتی ہے جو صرف سوچنے کو کافی سمجھ لیتا ہے اور یہ تکرار مادی حالات کی روشنی میں، یہ سوچنا بیکار نہیں ہوتا۔ جوانی ہمت کے سر پر تاج رکھ دیتی ہے اور نیا شعور بیدار ہوتا ہے۔ جذباتی طور سے یہ تاج پہن لینا تو خیال آرائی ہے لیکن راہ کی دشواریوں کا اندازہ لگا کر اس پر چلنا رومان پسندی نہیں ہے جس کی نظر میں تنقیدی صلاحیت نہیں ہے۔ اس کے لیے دونوں راستے ایک ہیں لیکن زیدی دونوں کا فرق سمجھتے ہیں:

غلط راہیں دکھاتا ہے طبیعت کا ابال اب بھی
یہ کاذب صبح راتوں کو بنا کرتی ہے جال اب بھی

علی جواد زیدی ان منزلوں کا پتا لگانا چاہتے ہیں جو اس راہ کے ہر مسافر کے سامنے آئیں گی۔ اپنی نظم 'منزلیں' میں انہیں منزلوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

تری منزل ہے آزادی کی منزل — تمناؤں کی آزادی کی منزل
تجھے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنا ہے — غلامی کی سلاخیں توڑنا ہے
وطن ہی کیا زمانہ ہے اندھیرا — مگر ہونے ہی والا ہے سویرا
نئی تعمیر تیرے ہاتھ میں ہے — تری تقدیر تیرے ہاتھ میں ہے
بڑھے جانا نہ ہرگز ہچکچانا
مسافر راستے میں رک نہ جانا

علی جواد زیدی کا خیال ہے کہ آزادی ہی ہر ہندوستانی کی منزل ہے اور آزادی کے بغیر زندگی کی لطافتیں اور سکون نہیں حاصل ہو سکتا اور بغیر قربانی کے آزادی ناممکن ہے اس لیے کہ دستور زمانہ کے مطابق آج تکلیف ہے کل آرام ہے، آج موت ہے کل زندگی ہے۔ یہ صرف نعرہ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ادراک و عمل کا بے پایاں طوفان ہے۔ یقین اور امید ہے اور وہی فنکار ترقی کی راہ پر گامزن ہے جو عمل کی راہیں دکھا کر ہمیں اپنی منزل تک پہنچا دے۔

اگست ۱۹۴۲ء کا خونی انقلاب ہماری تاریخ آزادی کا اہم موڑ ہے۔ اس موقع پر ہمارے ادیبوں اور شاعروں کے مختلف نظریات تھے۔ بہر حال جنگ نے ہر صاحب فکر و نظر کو سمجھنے، سوچنے اور اس سے نتیجہ اخذ کرنے کا بہترین موقع دیا اور ہر صاحب نظر یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جنگ ختم ہونی چاہئے ورنہ کروڑوں انسانوں کا خون رائیگاں جائے گا۔ اس بات کو سمجھ لیا گیا کہ اگر جنگ ہی کو ہم نے قوموں کی آزادی، انسانیت کی ترقی اور معاشی نابرابری سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا تو پھر ایک اور جنگ کا انتظار کرنا پڑے گا۔ عوام کی طاقتوں کو شکست مان لینا پڑے گا۔ ترقی کا گلا گھونٹ دینا پڑے گا اور صرف یہ کہہ کر چھٹکارا نہیں مل سکتا کہ یہ جنگ ہماری نہیں ہے۔ علی جواد زیدی جنگ کے حامی نہیں ہیں پھر بھی ان کا خیال ہے کہ اگر جنگ ہمارے اوپر ٹوٹ پڑتی ہے تو ہمیں لڑنا ہی ہے:

یہ جنگ ہماری کب ہے یہ جنگ کسی کی کب ہے
پھر بھی ہمیں لڑنا ہے پھر بھی ہمیں مطلب ہے

علی جواد زیدی کا خیال ہے کہ یہ جنگ تمام انسانوں کی جنگ ہے۔ ان تمام لوگوں کی جنگ ہے جو ایک روشن مستقبل کے خواہاں ہیں۔ وہ سرمایہ داری کے تضاد، شہنشاہیت کے زوال اور فرسودہ نظام کے کھوکھلے پن کا ضرور ذکر کرتے ہیں اور ان کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ وہ ناامید نہیں ہیں بلکہ انہیں اس نظام سے چھٹکارا ملنے کا یقین بھی ہے۔

وطن ہی کیا زمانہ ہے اندھیرا
مگر ہونے ہی والا ہے سویرا

علی جواد زیدی قوموں کی آزادی کو نزدیک سے دیکھنے کے خواہشمند ہیں اور اس میں وہ عملی طور سے شریک ہیں۔ وہ روس کی مدافعت کے معترف اور فاشزم کی مکمل تباہی کے خواہاں ہیں۔ اس خواہش میں وہ تمام ترقی پسندوں کے ہم نوا ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ سرمایہ داری کا قلعہ جب تک مسمار نہ ہو گا دنیا آزادی نہیں حاصل کر سکتی۔ اسی عملی زندگی کی وجہ سے انہوں نے جیل جانا گوارا کیا۔ زنداں کی چہار دیواری نے انہیں پاشکستہ نہیں بنایا بلکہ ان کے عمل کے جذبے کو اور مہمیز کیا۔ اپنے سیاسی رفیق علی سردار جعفری کی نظر بندی کی خبر سن کر وہ تلملا جاتے ہیں اور باوجود اصولی اختلاف کے انہوں نے ایک پرخلوص نظم کہی۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

گھر تو گھر تھا ہم نے پروائے حکومت بھی نہ کی
ہم تھے وہ محشر بدل فکر قیامت بھی نہ کی

علی جواد زیدی رومان پسند اور خیال پرست نہیں ہیں لیکن ان کی طبیعت میں جدت کا پوشیدہ عنصر انہیں کبھی کبھی عارضی اور وقتی جذبات کی گود میں ڈال دیتا ہے اور ان کے یہاں قنوطیت کا شدید جذبہ مایوسی میں بدل جاتا ہے۔ ان کی خواہشیں حقیقت پر غلبہ پا لیتی ہیں۔ 'اختتام قید' میں ان کی اس قنوطیت اور مایوسی کا پتا چلتا ہے:

قریب ختم ہیں وہ دن بھی زندگانی کے
جو لطف صحبت یاراں سے آشنا نہ ہوئے
چھپا ہوا یہ کوئی شعلہ آبشار میں تھا
کہ نیش تشنہ لبی ذہن مے گسار میں تھا
بھٹک کے آئی نہ ہونٹوں پہ مسکراہٹ بھی
سنی گئی نہ شمیم طرب کی آہٹ بھی
وہ حوصلے جو اسیری میں بھی بلند رہے
غضب یہ تھا کہ گرفتار قید و بند رہے
نجات بندش پیہم سے پا نہیں سکتا
غلام رہ کے کوئی مسکرا نہیں سکتا

چونکہ غلام ملک کبھی مسکرا نہیں سکتا ہے، اس لیے وہ یہ بھی کہتے ہیں:

کانٹوں سے بھری راہ پہ چلنا ہے تو کیا غم — مٹی کے نمو کے لیے جلنا ہے تو کیا غم
اس فکر میں کیوں لذت امکاں کو بھلا دیں — کیوں پھر سے نہ ہم محفل رندانہ سجا دیں

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ترقی پسند دور میں زیادہ تر شعرا کے یہاں ایک موضوعات پر مختلف نظمیں ملیں گی اور جب اس قبیل کی نظمیں جن میں سیاق و سباق شاعری شخصیت کا جزو بننے لگتے ہیں تو زیدی کے یہاں "دوراہے پر، منزلیں، جام بدست و جنازہ بدوش، گرفتاری کے بعد، جیل کی ایک رات، آغاز شباب اور ماں" جیسی نظمیں وجود پاتی ہیں جن میں سیاسی زندگی کی آپ بیتی موجود ہے۔ 'ماں' علی جواد زیدی کی ایک اہم نظم ہے۔ یہ ایک زمیندارانہ گھرانے کی ماں ہوتے ہوئے بھی ایک ہندوستانی ماں ہے، اس لیے یہ ماں اپنے بیٹے سے محبت کرتے ہوئے بھی اسے اپنے وطن پر قربان کر دیتی ہے اور بیٹا بھی اپنی دھرتی ماں پر اپنی ماں کو قربان کر دیتا ہے۔ یہ نظم زیدی نے اپنی ماں کو مخاطب کر کے لکھی ہے۔ کیونکہ کچھ قدامت پسند اعزا زیدی کی گرفتاری کو اپنے لیے باعث ننگ و عار سمجھتے تھے۔ اس نظم کے چند شعر بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں:

پائندہ باد رسم و رہ مہر مادری — تجھ سے جہاں میں روح خوشی کو دوام ہے
میرے عزیز لاکھ برائی کریں مری — تو دل میں خوش کہ تیرا پسر نیک نام ہے
مجھ کو بھی قید و بند سے الفت نہیں مگر — ظلم و ستم کی مجھ پہ اطاعت حرام ہے
تو جانتی ہے قلب حقیقت شناس کو — تو واقف فسانۂ زندان شام ہے

شاید تجھے بھی ہجر پسر یہ بتا سکے — زندان ودار ہند میں اک رسم عام ہے
جس نامراد ملک میں کی پرورش مری — صدیوں سے وہ امیر وفقیر وغلام ہے

اس نظم میں علی جواد زیدی نے اپنے پورے عقیدے کی وضاحت کر دی ہے۔ وہ اس غلام ملک میں قید رہنا رہائی سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اپنے سیاسی رفیق قاضی جلیل عباسی کی رہائی پر اپنے عقیدے کی مزید وضاحت کرتے ہیں:

رہائی لفظ بے معنی ہے دنیائے غلامی میں — یہاں افراد کیا خود ملک ہے قید دوامی میں
ہر اک گوشے پہ قید وبند کے قانون حاوی ہیں — یہاں نوعیتیں آزاد وقیدی کی مساوی ہیں
ہمارا ملک اک زندان بے دیوار ہے ہمدم — یہاں ہر اک قدم پر امتحان دار ہے ہمدم

اس کے علاوہ "آج بھی، وصیت، ہوا کے گیت، اہنسا کی لڑائی، پریم جگت، شیطانی سازش، اختتام قید، جیل کا اسپتال" وغیرہ ان کی سیاسی زندگی کی کامیاب نظمیں ہیں۔ اس کے بعد علی جواد زیدی اپنی ذات سے کسی قدر دور اور سماج سے بہت حد تک قریب ہو جاتے ہیں۔ "نعرۂ امن، معمار آزادی، ماسکو کے محافظ، مادر ہندوستان، روسی سپاہیوں کو پیغام اور بہار پھر بھی بہار ہے" وغیرہ میں اس پہلو کو دیکھا جا سکتا ہے۔ 'بہار پھر بھی بہار ہے' کا ایک بند پیش کیا جارہا ہے:

میں جانتا تھا قدم قدم پر بچھے ہیں راہوں میں خار اب بھی
ستا رہا ہے، رلا رہا ہے، وہی غم روزگار اب بھی
مگر یہ احساس کیوں ہے دل میں کہ دلربا ہے بہار اب بھی

اس نظم میں آزادی کی جدوجہد کو کس قدر رمزیت اور رنگینی سے بیان کیا ہے اس کا اندازہ تو صاحبان ذوق ہی کر سکتے ہیں۔

'کشمکش' میں علی جواد زیدی نے طبقاتی کشمکش کی نشاندہی کی ہے۔ یہ ان کی شاعری کے دور عروج کی کامیاب نظم ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

گودی کی مہ وسال میں مچلوں کہ نہ مچلوں؟
آتے ہوئے آلام کا ڈر روک رہا ہے
منزل کی طرف باگ کو موڑوں کہ نہ موڑوں؟
کوئی مری ہر راہ گزر روک رہا ہے
فرسودہ نظاموں کو بدل دوں کہ نہ بدلوں؟
تہذیب کا ہلتا ہوا سر روک رہا ہے

رکنے کا بھی امکان ہے چلنے کا بھی امکان
جلنے کا بھی امکان ہے پھلنے کا بھی امکان
تھمنے کا بھی امکان ابلنے کا بھی امکان
گرنے کا بھی امکان سنبھلنے کا بھی امکان

طوفان سے کشتی کو نکالیں تو مزا ہے
ہستی کو تباہی سے بچالیں تو مزا ہے

اردو میں آزاد نظم ترقی پسندی کی دین ہے جس کی زبردست مخالفت بھی کی گئی ہے لیکن ترقی پسندوں نے اس کی پروا نہ کرتے ہوئے بہت سی کامیاب نظمیں لکھیں اور آج تو آزاد نظم کو حسن نظر سے دیکھا جارہا ہے۔ علی جواد زیدی نے بھی کئی آزاد نظمیں کہی ہیں، ان میں سے "کڑی دھوپ، دوست، دوستی، عجیب تنہائی، چمنی کا دھواں، لاش اور ہولی" ان کی کامیاب نظمیں ہیں۔ 'لاش' ان کی ایک اہم نظم ہے۔ فارسی اور اردو کے مشہور شاعر اقبال احمد سہیل جو کہ آزاد نظم کے قائل نہ تھے نے اس نظم کو پڑھنے کے بعد کہا تھا:

"اگر نئے شعرا ایسی نظمیں لکھیں تو مجھے آزاد نظم سے کوئی بیر نہیں۔"

(بحوالہ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک: خلیل الرحمن اعظمی)

یہ نظم مہادیو دیسائی کی موت پر لکھی گئی ہے اور زیدی کی کامیاب نظموں میں سے ہے:

یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں
یہ دور اپنے آشرم کو چھوڑ کر
یہ اپنے ٹوٹے جھونپڑے سے اپنے منہ کو موڑ کر
یہ ظلم وجور کی بھری کلائیاں مروڑ کر
نکل پڑا
اندھیری رات تھی مگر یہ چل پڑا
کوئی بھی ہو عزیز ہے
کہ اس جری نے جان دی ہے جشن رزم گاہ میں
یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں

علی جواد زیدی کی شاعری میں کلاسیکی انداز اور عملی زندگی کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کی یہ خصوصیت تو عام ہے لیکن چھوٹی اور مترنم بحروں کی نظموں میں یہ انداز اور بھی دلنواز ہو جاتا ہے۔ ان کی نظم 'مست جواں' جو کہ بہت مشہور ہوئی۔ یہ نظم فنی اعتبار سے بہت بلند پایہ نہ ہوتے ہوئے بھی اتنی کامیاب اور پسند کیوں کی گئی؟ اس کا ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے نغمگی اور موسیقیت کے ساتھ دریا کی سی روانی جو قاری کو اپنے مترنم لب ولہجہ کے ساتھ بہالے جاتی ہے۔ اس نظم کا ایک بند بطور نمونہ حاضر خدمت کیا جارہا ہے:

گولی کی زد پہ جم گئے سینوں کو تان کے
توپوں کے منہ پہ ڈٹ گئے انجام جان کے
کیا ویر تھے سپوت یہ ہندوستان کے
کیسے یہ مست لوگ تھے کیا نوجوان تھے

۱۹۴۲ء کا آندولن ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے جس میں ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس تحریک سے متاثر ہو کر ان کے قلم سے بہت سی نظمیں وجود میں آئیں۔ علی جواد زیدی تو اس آندولن میں عملی طور سے شریک بھی تھے اور اس سلسلے میں اعظم گڑھ میں ان کے مکان پر چھاپہ بھی پڑا۔ قیام

اعظم گڑھ ہی میں زیدی اور شمیم کرہانی نے اس موضوع پر بہت سی کامیاب نظمیں لکھیں۔ ان میں زیدی کی دو نظمیں 'دھارے کا موڑ' اور 'ہولی' بہت مشہور ہوئیں۔ ان میں 'دھارے کا موڑ' دراصل ایک گیت ہے اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمائیں:

کھیتوں کی زمین دھنس رہی ہے
بدمست پڑے ہیں راجہ رانی
گو محلوں کی نیو ہے پرانی
بے فکری پہ موت ہنس رہی ہے
دھارے کے موڑ سے خبردار!

زیدی کی دوسری کامیاب نظم 'ہولی' ہے جسے کرشن چندر کی مرتب کردہ کتاب 'نئے زاویے' اور خلیل الرحمن اعظمی کی مرتبہ کتاب 'نئی نظم کا سفر' کے علاوہ اور کئی مجموعوں میں منتخب کیا گیا اور غالباً زیدی کے دور عروج کی سب سے کامیاب نظم ہے۔ 'ہولی' طویل نظم ہے اور اس میں ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی مختلف منازل کی علامتی انداز میں بڑی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ زیدی نے اس نظم میں حالات کی سنگینی کو تخیل کی مدد سے بہت ہی اثر انگیز بنادیا ہے اور 'ہولی' کو ایک زندہ علامت بنا کر آزادی کی جدوجہد بالخصوص 'ہندوستان چھوڑو تحریک' کو بڑی رنگینی اور رمزیت کے ساتھ بیان کیا ہے:

منہ میکدے سے موڑ کر ہولی کی یہ ٹولی چلی
گلزار میں
سبزے، لچکتی ڈالیاں، گنجان، سندر جھاڑیاں
پانی کی سینچی کیاریاں، کانٹوں میں چھپتی پتیاں
یہ سب سہی لیکن یہاں وہ شے کہاں
جس کے لیے مشہور ہے انگور ناب
ہاں کیا کہا، پیر مغاں
تلوؤں کے نیچے پھول ہیں، ان میں سے دو ایک چن بھی لوں
خالی ہیں گلدستے ترے
تجھ کو نہیں معلوم ابھی
خالی یہ گلدستے ترے خالی ہی رہ جائیں گے اب
پھولوں نے ٹھانی ہے کہ شاخوں ہی پہ مرجائیں گے اب

تو ڈر گیا پیر مغاں
کتنا بھیانک خواب تھا
تعبیر کچھ بھی ہو مگر
تیرے وفاداروں نے کل
کس آن سے، کس بان سے، کس شان سے
کھیلیں گا ہی ہولیاں

علی جواد زیدی نے شاخ، پھول، سبزے، گلدستے، ڈالیاں، جھاڑیاں وغیرہ کے اس پیرائے میں جدوجہد آزادی کے ایک ایک موڑ کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

'نیا سال' اور 'کشمیر' بظاہر بیانیہ نظمیں ہیں لیکن زیدی نے ان میں بھی ندرت فکر اور جدت ادا کے پہلو نکال لیے ہیں۔ 'کشمیر' میں شاعر نے تاریخی واقعات اور اپنے قلبی احساسات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ سب ایک دوسرے سے ہم آہنگ محسوس ہوتے ہیں کے دو بند بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں:

علی جواد زیدی نئی منزل کی تلاش میں ہیں اور انہیں یقین ہے کہ وہ دور ضرور آئے گا اور اس نئے دور کا آغاز ضرور ہوگا۔ اس لیے وہ مشورہ دیتے ہیں کہ ہمیں ہمت نہیں ہارنا چاہئے اور عزم و عمل اور حوصلہ کو بروئے کار لا کر اس نئے دور کا آغاز کرنا ہے:

دور ہے منزل مقصود مگر ہے تو سہی
رہبروں کا کوئی معیار نظر ہے تو سہی
جرأت و عزم یہ انداز سفر ہے تو سہی

اپنی ایک دوسری نظم 'درمیانی منزل' میں یہ کہتے ہیں کہ ابھی تو سفر کی ابتدا بھی نہیں ہے۔ اس سفر کی جس کا خواب ہم نے دیکھا تھا۔ اس سفر میں منزل کے لیے ہمیں بہت سی پریشانیاں اٹھانی ہیں اور راستہ تلاش کرنا ہے:

مگر ابھی تو سفر کی یہ ابتدا بھی نہیں
ابھی تو شہر کی سرحد کے پار نکلے ہیں
ابھی فصیل سے کچھ دور کارواں والے
بنے نظارۂ لیل و نہار نکلے ہیں

اور اسی نظم میں زیدی کہتے ہیں کہ ابھی تو مکمل آزادی ہمیں ملی بھی نہیں اور ہم ابھی سے چاہتے ہیں کہ آرام و سکون سے رہیں۔ ابھی سے ہمیں آرام کی خواہش نہیں کرنا چاہئے، اس لیے کہ مکمل آزادی اسی وقت ملے گی جب ہم اپنے آپ کو آزاد محسوس کریں۔

ابھی تو منزل اول ہے اے رفیق سفر
ابھی سے خواہش آرام فکر عصیاں ہے
ہمارا قافلہ اس منزل گریزاں میں
بس ایک شب کا فقط ایک شب کا مہماں ہے

یہی وجہ ہے کہ علی جواد زیدی نے آزادی کے بعد بھی ہمت نہیں ہاری بلکہ اس نازک دور میں بھی تعمیری نظریہ پیش کرتے ہیں، اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ آزادی سے پہلے ہمارا مقصد وطن کو آزاد کرانا تھا اور آزادی کے بعد ہمیں ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے کوشاں رہنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد زیدی نے شاعری پر کم توجہ کی اور تحقیق و تنقید کے ساتھ ساتھ تعمیری ادب کے پیروکار رہے۔

☆☆☆☆